مجاہد حسین
پی ایچ ڈی اسکالر
شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

سر سیّد احمد خاں کے تعلیمی افکار اور اردو

ABSTRACT

Sir Syed Ahmad Khan's educational idealogy and Urdu
By Mujahid Hussain, Ph. D. Scholar, Department of Urdu, University of Punjab, Lahore.

The reformist movement launched by Sir Syed Ahmad Khan for the uplift of Muslim's educational and social domains has been drawing attention till today.

Establishing Western-style educational institutes and implementing modern syllabi were the important ingredients of Sir Syed's education policy is debatable but this article especially takes into account Sir Syed's stance on the medium of instruction for subcontinent's Muslim. It also discusses the reasons for the change of his stance on the issue.

سرسید کے حامیوں نے اس تاثر کو بھی عام کیا کہ سرسید انگریزی کی بجائے اردو ذریعہ تعلیم کے حامی تھے اور وہ اردو کو ہی ذریعہ تعلیم دلوانے کے لیے کوشاں رہے۔ یہ بات درست ہے کہ سرسید احمد خاں ابتدائی دور میں اردو میں تعلیم کے حامی تھے۔ اور اسی بات کے حق میں تھے کہ ہندوستان کے لوگوں کو تعلیم ان کی اپنی زبان میں دی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہندوستان کو شائستگی اور تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔ اس حوالے سے سرسید کا کہنا تھا:

> اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیئے جائیں گے، کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہونے کا۔ یہی سچ ہے، یہی سچ ہے، یہی سچ ہے۔(۱)

سرسید کے اسی بیان کی بنیاد پر یہ تاثر عام ہوا کہ وہ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں تھے۔ بہت سے لکھنے والوں نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ اس حوالے نے مولوی عبدالحق نے لکھا:

> قصرِ پاکستان کی بنیاد میں ''پہلی اینٹ'' اسی پیرمرد (سرسید) کے مبارک ہاتھوں نے رکھی اور وہ اینٹ اردو زبان تھی۔(۲)

سرسید ابتدا میں مقامی زبانوں یا زبان میں تعلیم کے حق میں تھے مگر سفر یورپ ۱۸۷۰ء کے بعد ان کے خیالات

میں تبدیلی آئی۔ وہ یورپ میں جدید معیارِ تعلیم سے بہت متاثر ہوئے اور مسلمانوں کی تعمیر وترقی کے لیے جدید علوم کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اس نظریے کا اظہار کیا کہ مقامی زبانیں اس قابل نہیں کہ ان میں جدید علوم کی تعلیم دی جا سکے لہٰذا جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم صرف اور صرف انگریزی زبان میں ہی ممکن ہے۔ وہ اس حوالے سے لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے پوری طرح ہم خیال تھے جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی تعلیم وترتیب دیسی زبانوں میں کرنے کی بجائے کسی دوسری زبان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں نظامِ تعلیم کی تبدیلی کے حوالے سے پیش کی جانے والی یادداشت میں لکھا تھا:

> تمام طبقے اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان کے اس حصہ کے بسنے والے جو مختلف بولیاں بولتے ہیں، وہ ادبی وعلمی معلومات سے یکسر تہی دامن ہیں۔ پھر اُن کے الفاظ کا ذخیرہ اس قدر کم اور انداز بیان اس حد تک ناتراشیدہ ہے کہ جب تک اُنھیں کسی اور ذریعہ سے وسیع نہ کیا جائے۔ اُن میں کسی قابلِ قدر علمی کام کو منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز اب بدیہی حقیقت کے طور پر سامنے آچکی ہے کہ اس ملک کے جو طبقے اعلیٰ تعلیم پانے کے وسائل رکھتے ہیں، اُن کی ذہنی نشوونما دیسی زبانوں کے سوا کسی دوسری زبان کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے۔
>
> ہم اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہیں کہ ساری قوموں کے لوگ ہماری زبان سے اس حد تک واقف ہیں جس سے وہ بآسانی اُن دقیق اور پیچیدہ مسائل کو سمجھ سکتے ہیں جس سے اس زبان کا دامن بھرپور ہے اور اس کے ذریعے وہ ان ادبی طافتوں سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہونے کی استعداد رکھتے ہیں جو ہمارے ہاں کے اعلیٰ انشا پردازوں کی تحریروں میں موجود ہیں۔ (۳)

سرسید نے جب تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی تو انھوں نے اپنی رائے اسی حوالے سے اردو اور انگریزی میں لکھ کر شائع کی۔ اس کتابچے میں انھوں لارڈ میکالے سے اتفاق کرتے ہوئے اردو زبان کو تعلیم وتربیت کے لیے ناموزوں قرار دیا اور نام لیے بغیر انگریزی زبان میں ہندوستانیوں کی تعلیم وتربیت کی بات کی۔ انھوں نے تعلیمی حوالے سے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا:

> ہم علوم مشرقی کی ترقی کے معنی نہیں سمجھتے، نہ علوم مغربی کا دیسی زبانوں کے ذریعے سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک شائع ہونا ممکن جانتے ہیں۔
>
> علوم مشرقی کی ترقی اور چھوٹی موٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہم کو کیا نتیجہ دیں گی

اور ہم کو کون سی عزت و دولت و حشمت و حکومت بخشیں گی؟

...یونی ورسٹی کالج لاہور، جو پوری یونی ورسٹی ہونے والا ہے، بجز اس کے کہ ہم کو سیدھی راہ چلنے سے روکے، ہم کو ہمارے حقوق سے محروم رکھے، ہم کو اس لائق نہ ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکیں، ہمارے حق میں اور کیا کر سکتا ہے؟...ہم کو علوم مشرقی کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا صرف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے... پس پنجاب یونی ورسٹی اگر وہ قائم ہو جائے تو ہمارے حق میں بجز اس کے کہ ہماری اعلیٰ درجہ کی یورپین تعلیم کو برباد کر دے اور اس پالیسی پر عمل کرے جو ہمیں برباد کرنے والی ہے، اور کیا کرے گی؟(۴)

اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا تو سر سید احمد خاں نے اس کی مخالفت بھی اسی وجہ سے کی کہ اورینٹل کالج مشرقی علوم کی درس گاہ بننے جا رہا تھا اور سر سید احمد خاں انگریزی تعلیم کی اہمیت کے حامی تھے۔

انھوں نے متعدد تحریروں اور تقریروں میں اورینٹل کالج کی مخالفت کی ڈاکٹر زاہد منیر عامر تاریخ جامع پنجاب میں لکھتے ہیں:

دراصل بات یہ تھی کہ سر سید احمد خاں مغرب اور مغربی علوم و فنون کو ہندوستانیوں کی ترقی کے لیے اس درجہ ضروری سمجھتے تھے، اورینٹل کالج یا پنجاب یونی ورسٹی مغربی علوم و فنون کے اس درجے کے داعی نہیں تھے، اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان اداروں میں مغربی علوم و فنون کی راہیں بند کر دی گئی تھیں یا ایسا کوئی عزم ظاہر کیا گیا تھا، پنجاب یونی ورسٹی کالج کے قیام کے وقت بھی اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ انگریزی تعلیم مجوزہ یونی ورسٹی میں تعلیم کی ایک بڑی شاخ ہوگی اور وہ مضامین کہ جن میں دیسی زبان میں تعلیم اور امتحان دینا ممکن نہیں ہے ان میں انگریزی کو اختیار کیا جائے گا اور یہ یونی ورسٹی اس بات کا اہتمام کرے گی کہ تمام علوم و فنون دیسی زبانوں کے ذریعے یورپین طریقِ تعلیم کے موجب سکھلائے جائیں گے، تعلیم اگرچہ دیسی زبان میں ہوگی مگر اس کی نگرانی ایسی ہوگی کہ طلبا کو فوائد تعلیم حاصل رہیں جو ہندوستان کی دیگر یونی ورسٹیوں سے حاصل ہوتے ہیں۔(۵)

سر سید احمد خاں نے مقامی زبانوں کو جدید علوم کی تعلیم کے لیے نا موزوں قرار دیا۔ ان کی یہ بات کسی حد تک

درست تھی کیوں کہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں شاید کوئی بھی زبان اس وقت تک اتنی وقیع نہیں تھی کہ جدید علوم اس میں پڑھائے جا سکتے، نہ جدید علوم کی کتب مقامی زبانوں میں تھیں۔ اسی لیے سرسید نے مقامی زبانوں پر انگریزی کو ترجیح دی۔ کیوں کہ ان کے خیال میں انگریزی زبان میں جدید علوم کی تعلیم کے لیے جو وسعت تھی کوئی مقامی زبان اس قابل نہ تھی۔ لہٰذا سرسید نے کہا:

> اردو زبان، جس کے وسیلہ سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے، اس کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو کیوں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں، اس زبان کی نسبت ہم کو اول یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں، کیوں کہ اگر یہ نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اس میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں، کیوں کہ پہلی بات کا تو علاج ہو سکتا ہے مگر دوسری بات لا علاج ہے۔ تیسرے یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اس میں علوم پڑھنے سے جودت طبع، حدت ذہن، سلاست فکر، ملکہ عالی، قوت ناطقہ، پختگی تقریر اور ترتیب و دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؟ ان تینوں باتوں میں سے اردو زبان میں کوئی بات نہیں۔ پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اس طریقہ تعلیم کو جو درحقیقت تربیت انسان کو خراب کرنے والا اور خودبخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے، بالکل بدل دے اور اس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا جو اصلی نتیجہ ہے وہ حاصل ہو۔ میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسے اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہے، جاتی رہے۔ صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی زبان کے وسیلہ سے تربیت کرتی ہے اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔(۶)

سرسید احمد خاں نے اور موقع پر اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔

> انگریزی، قطع نظر اس کے کہ وہ ہمارے حاکموں کی بھی زبان ہے اور علاوہ علوم حاصل کرنے کے اور بہت سے وجوہ سے ہمارے لیے کارآمد ہے، ہماری دسترس میں ہے اور اس لیے لازم ہو گیا ہے کہ ہم اسی زبان میں ان علوم کو حاصل کریں۔(۷)

سرسید احمد خاں مردوں کی تعلیم کے تو حق میں تھے مگر خواتین کی جدید تعلیم کی طرف ان کی کوئی توجہ نہ تھی۔ اس

حوالے سے ان کا خیال تھا کہ خواتین کو جدید تعلیم دینے کی ضرورت نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر موجودہ حالات میں خواتین کو جدید تعلیم دی گئی تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں اور اس مقصد کے لیے خرچ کی جانے والی رقم اور محنت برباد ہو جائے گی۔ سرسید کا خیال تھا کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے قدیم ترین طریقہ کار ہی مفید ہے اور وہ کتب جو ہماری دادیاں اور نانیاں پڑھ آئی ہیں آج بھی خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے مفید ہیں۔ اس حوالے سے سرسید کا کہنا تھا:

> حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اُس وقت تک نہ ہو گی جب تک اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے، وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے۔ جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے، وہ یہ ہے مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے بندوبست کی جانب کافی توجہ کرے۔ اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسواں کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو حالت موجودہ میں محض ناکامی حاصل ہو گی اور میری رائے ناقص میں اس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے اور روپیا اور محنت ضائع جائے گی۔(۸)

سرسید کے خیال میں عورتوں کے لیے یہ تعلیم کافی تھی کہ وہ نیک اخلاق اور نیک عادات و خصائل سیکھ لیں، امورِ خانہ داری اور بچوں کی پرورش کی ماہر ہو جائیں، مذہبی عقائد کو جان لیں اور بس۔ سرسید لکھتے ہیں:

> میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم اُن مقدس کتابوں کے بدلے، جو تمھاری دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانہ کی مروجہ نا مبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی ہیں۔ سچی تعلیم نہایت عمدگی سے اُن کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمھاری دادیاں نانیاں پڑھتی تھیں۔ جیسی وہ اُس زمانہ میں مفید تھیں ویسی ہی اس زمانہ میں مفید ہیں۔(۹)

سرسید احمد خاں نے عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی مخالفت ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے کی۔ ہندوستان میں عورتوں کی ملازمت کا اس وقت تک کوئی تصور نہ تھا اس لیے سرسید یہ سمجھتے تھے کہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہیے۔ بعض لوگ جو خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں تھے انھیں مخاطب کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا:

> وہ علوم... جن کو اس زمانہ میں یورپ کی تقلید سے لڑکیوں کی تعلیم میں لوگ داخل کرنا چاہتے ہیں، یورپ کی اور امریکہ کی حالت معاشرت کے خیال سے وہ علوم لڑکیوں کو سکھانے ضرور ہوں کیوں کہ ممکن ہے کہ وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹر اور ٹیلی گراف ماسٹر

زیا پارلیمنٹ کی ممبر ہوسکیں لیکن ہندوستان میں نہ وہ زمانہ ہے، نہ سیکڑوں برس بعد بھی آنے والا ہے۔(۱۰)

سرسید احمد خاں نے درج بالا وجوہ کی بنیاد پر خواتین کو جدید اعلیٰ تعلیم دینے کی مخالفت کی تھی ہندوستانی عورت کا کام گھریلو ذمے داریاں اور بچوں کی نگہداشت ہے سوایسی تعلیم وہ بزرگ خواتین سے حاصل کر لیتی ہیں۔لیکن سرسید کی مخالفت کرنے والے طبقے نے تاثر دیا کہ سرسید خواتین کو اس قابل ہی نہ سمجھتے تھے کہ انھیں اعلیٰ تعلیم دی جائے۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں میں جدید مغربی علوم کو فروغ دینے کے لیے علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا۔ یہ کالج ترقی کرتے کرتے آخر کار یونی ورسٹی تک پہنچ گیا۔اس ادارے نے برصغیر پاک وہند میں جدید مغربی علوم کے حصول میں اہم کردار ادا کیا۔سرسید نے بہت سے مواقع پر اس کالج کے قیام کی غرض وغایت بیان کی۔یہ کالج برصغیر کے مسلمانوں میں جدید مغربی علوم کو فروغ دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔اس حوالے سے سرسید کا بیان ہے:

اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں پورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو ازرُوئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر بااعتبار مذاق اور رائے وفہم کے انگریز ہوں۔(۱۱)

اسی کے ساتھ ساتھ سرسید نے علی گڑھ کالج کے قیام کے مقصد پر بات کرتے یہ بھی کہا کہ کالج قائم کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں دوستانہ مراسم پیدا ہوں اور فریقین کے مابین جو تعصب اور نفرت ہے وہ دور ہو۔اسی حوالے سے سرسید کا خیال تھا کہ جب تک دونوں اقوام میں اعتماد کی فضا قائم نہیں ہوگی مسلمانان ہند خسارے میں رہیں گے۔ اسی لیے ان کا کہنا تھا:

میرا سب سے بڑا مقصد کالج کے قائم کرنے سے یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور انگریزوں میں دوستانہ راہ ورسم پیدا ہو اور آپس کا تعصب اور نفرت دور ہو۔(۱۲)

سرسید نے اس حوالے سے مزید کہا:

مجھے اُمید ہے کہ تم اِس نشان کو اپنے دلوں میں بھی نقش کرو گے اور یاد رکھو گے کہ اس کالج کا بڑا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد ہو اور وہ ایک دوسرے کے اغراض میں یک جان اور دوقالب ہو کر، جیسا کہ اس نشان میں کریسنٹ اور کراس یک جان ودوقالب ہیں، شریک رہیں گے۔(۱۳)

سرسید دراصل مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان کی نفرت ختم کر کے مسلمانوں کے حکومت کے ساتھ تعلقات

میں بہتری کے خواہاں تھے۔ ان کے خیال میں حکومت اور مسلمانوں کی دوری مسلمانوں ہی کو نقصان پہنچائے گی۔ علی گڑھ کالج کے قیام کے مقاصد پر بات کرتے ہوئے سرسید نے یہ کہا:

> ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کی لائق وکار آمد رعایا بنانا اور اُن کی طبیعتوں میں اس قسم کی خیر خواہی پیدا کرنا جو ایک غیر سلطنت کی غلامانہ اطاعت سے نہیں بلکہ عمدہ گورنمنٹ کی برکتوں کی اصل قدر شناسی سے پیدا ہوتی ہے۔(۱۴)

علی گڑھ کالج نے اپنے قیام کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ مقبولیت حاصل کی جو بہت کم اداروں کو مل سکی۔ سرسید اس ادارے کی ترقی اور روز بروز بڑھتی طلبہ کی تعداد سے بھی بہت خوش تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کالج نے اپنے قیام کے بیس سال کے اندر جو تعداد طلبہ میں ترقی کی ہے ہم کو اس کی توقع نہ تھی۔ مزید یہ کہ اس ادارے نے انگریزی حکومت اور مسلمانانِ ہند کے مابین فاصلے کم کرنے کے لیے جو کوشش کی اس کے بھی خاطر خواہ نتائج سامنے آئے۔ اس بات پر انگریزی حکام نے بھی خوشی کا اظہار کیا کہ اس کالج کے فارغ التحصیل انگریزی حکومت کے سچے خیر خواہ ہیں۔

علی گڑھ کالج نے بلا شبہ بہت ترقی کی اور انگریزی حکومت اور مسلمانوں کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عام لوگ اس ادارے کے نتائج سے مطمئن نہیں تھے۔ سرسید کے بہت سے قریبی ساتھیوں کا بھی یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج وہ نتائج دینے میں ناکام رہا جن کی اس ادارے سے توقع کی جا رہی تھی۔ مولانا حالی نے اس حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا:

> اِن نتائج سے محمڈن کالج کی کوئی ایسی خصوصیات ظاہر نہیں ہوتی جس کی رُو سے اس کو ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دی جا سکے یا اِس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے۔ سوا اس کے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کسی قدر زیادہ پائی جاتی ہے، کوئی تفاوت تعلیم اور نتائج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا۔ نہ یہاں کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی لیاقت میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونی ورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ پس تاوقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جائے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی انسٹی ٹیوشن نہیں ہے۔(۱۵)

اس بحث کے بعد ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کے پیش نظر علی گڑھ کالج کے قیام کا مقصد مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم بھی تھا اور انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلوں کو کم کرنا بھی۔ اس زمانے میں کہ جب مسلمانانِ ہند اپنا اقتدار کھو بیٹھے

تھے اور ان کے اور انگریزوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم نہ تھا ایسی کسی کوشش کا کیا جانا بے حد ضروری تھا تا کہ دونوں اقوام ایک دوسرے کے قریب آسکیں اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ سکیں۔ مزید یہ کہ چوں کہ مسلمان عسکری طور پر کمزور تھے اس لیے حالات کے ساتھ سمجھوتہ ہی مسئلے کا حل تھا اور اسی کے لیے سرسید احمد خاں نے کوشش کی۔ کیوں کہ حکومتِ وقت سے ٹکراؤ کا نقصان بہ ہر حال مسلمانانِ ہند کو ہی ہوتا اور ہندو اس صورتحال کا پوری طرح فائدہ اٹھاتے۔ لہٰذا سرسید نے جو کہا وہ تقاضائے وقت کے عین مطابق تھا۔ اسی وقت اگر سرسید بھی دوسرے بہت سے مسلمانوں کی طرح انگریزی حکومت کی مخالفت اور ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرتے تو مسلمانانِ ہند جدید تعلیم سے محروم رہ جاتے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ ہوتا۔ تاہم سرسید دور بین انسان تھے اور ان کی کاوشوں کے دوررس نتائج سامنے آئے۔ اس حوالے سے صفدر سلیمی لکھتے ہیں:

> اگر سرسید کا یہ شاہکار (مدرسۃ العلوم) سامنے نہ آتا تو اس ملک کی فضاؤں میں نہ محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں کے نعرہ ہائے حُریت سنائی دیتے، نہ اقبال کے حیات آفریں نغموں کی گونج فردوسِ گوش بنتی اور نہ وہ قائداعظم میدانِ قیادت میں نظر آتا جس کا تدبر برطانوی سامراج اور ہندو سامراج کے لیے ملک الموت ثابت ہوا اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم مملکت کا نقطۂ آغاز۔[۱۶]

ریاض الرحمٰن شروانی نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> اس برصغیر میں تو مسلمان شُودروں سے بدتر ہوتے، اگر سرسید نے ان کی تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں رہنمائی نہ کی ہوتی۔ سرسید کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جتنا بڑا کارنامہ پچھلے سوا سو، ڈیڑھ سو برسوں میں کسی اور کا نہیں۔[۱۷]

سرسید احمد خاں نے مسلمانانِ ہند کو جدید تعلیم سے روشناس کرایا۔ ان کی یہ خدمت کارِ عظیم ہے مگر اس حوالے سے یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ سرسید نے ہمیشہ رؤسا اور امرا کے بچوں کی تعلیم کی بات کی۔ کسی غریب اور نچلے طبقے کے مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی بات نہ کی۔ انھیں ہمیشہ امرا اور رؤسا کے لڑکوں کی تربیت کی فکر رہی۔ وہ اس بات پر پریشان رہتے تھے کہ امرا اور رؤسا کے لڑکوں کا اخلاق نچلے طبقے کے لڑکوں کے ساتھ یا بازاری لڑکوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے بگڑا جاتا ہے اور امرا اور رؤسا اس جانب کوئی توجہ نہیں دیتے۔ مزید یہ کہ وہی لڑکے جب بڑے ہوتے ہیں تو وہی بازاری اور نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے لڑکے ان کے مصاحب بن جاتے ہیں۔ اس صورتحال سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ رؤسا اور امرا کے بچوں کی تعلیم و تربیت ان عام بچوں سے الگ رکھ کر کی جائے۔ سرسید کا خیال تھا کہ امرا رؤسا کے بچے محنت سے عمدہ نتائج دے سکتے ہیں لہٰذا پہلے ان پر محنت کی جائے اور ایک ایسا طبقہ وجود میں آجائے جو بعد ازاں قومی تربیت میں ممد و معاون ہو۔ وہ اخلاق و تربیت کے جس مرحلے پر فائز ہیں اس سے اوپر جانے کے بجائے نیچے آرہے ہیں۔ سرسید کو اس بات پر دکھ

تھا۔ امرا اور رؤسا کے بچوں کے حوالے سے کہتے ہیں:

> میں نے بڑے بڑے امیروں کے بچے دیکھے ہیں۔ وہ نوکروں کے لونڈوں، اور اگر وہ نہیں تو بازاری لونڈوں، کی صحبت اُٹھاتے ہیں۔ گالی گلوچ، بُرے الفاظ، بداخلاقی کی باتیں، خراب عادتیں سنتے، دیکھتے اور سیکھتے ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔(۱۸)

سرسید اس حوالے سے امرا سے یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بچوں کی تربیت کے حوالے سے کیا کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> میں پوچھتا ہوں کہ آپ صاحبوں نے اپنی اولاد کے اخلاق درست کرنے کی کیا تدبیر کی ہے؟ کیا آپ کے لڑکوں کے ساتھ آپ کے سائیس کے لونڈے نہیں کھیلتے یا ماماؤں اور اُن کے لڑکوں میں آپ کے لڑکے نہیں کھیلتے؟ کیا اپنے لڑکوں کو بازاری لونڈوں کی صحبت سے بچانے کے لیے آپ کچھ فکر فرماتے ہیں؟ ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ کچھ نہیں۔ وہی بداخلاقی، بدزبانی، کمینہ عادت جو اُن کمینہ لونڈوں سے آپ کے لڑکے سنتے اور دیکھتے ہیں، وہی وہ بھی سیکھتے ہیں اور وہی بداخلاقی اُن میں اثر کر جاتی ہے۔(۱۹)

امرا اور رؤسا کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انھوں نے یہ حل تجویز کیا کہ ان بچوں کو عام بچوں سے الگ رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کی جائے۔ اس کے لیے انھوں نے مدرسۃ العلوم کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس کا قیام لازمی قرار دیا تاکہ امرا کے بچے بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر زندگی کی اعلیٰ اقدار سیکھیں۔ اس حوالے سے سرسید کا یہ بھی کہنا تھا کہ انگلستان میں تمام بڑے لوگوں کے بچے بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر ہی اعلیٰ تربیت حاصل کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں پر یہ اعتراض بھی اٹھایا جاتا ہے کہ انھوں نے امرا اور رؤسا کے بچوں کے لیے تو جدید اعلیٰ تعلیم کو لازمی قرار دیا مگر غریب افراد کے بچوں کے لیے انھوں نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا، اس حوالے سے ان کا یہ خیال تھا کہ جس حیثیت اور درجے کے یہ لڑکے ہیں ان کو انگریزی پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ان لڑکوں کے لیے صرف اتنی ہی تعلیم کافی ہے کہ انھیں لکھنا پڑھنا اور ضروری حساب کتاب آجائے۔ مزید یہ کہ کچھ مذہبی تعلیم دے دی جائے۔ اس طرح دیہاتی بچوں کی تعلیم کے حوالے سے بھی سرسید نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا کہ انھیں دیسی زبان میں ''بدرجہ اعتدال'' لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جائے۔

سرسید کی تمام تعلیمی کوششوں کا مطلب یہ ہوا کہ امرا کے بچوں کے لیے تو اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا جائے جو ابتدائی تعلیم رکھتے ہیں، غربا اور نچلے طبقے کے بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم یعنی دیسی زبان میں درجہ اعتدال تک تعلیم کافی ہے۔ اس

حوالے سے حفیظ ملک لکھتے ہیں:

> سرسید کی اس تمام تگ ودو کا مطلب یہ ہوا کہ غربا کے لڑکے تو ادنیٰ تعلیم بھی نہ حاصل کر پائیں اور اعلیٰ درجے تک کی کل تعلیم کے حقدار صرف امیرزادے ہوں۔ جب مالی لحاظ سے معاشرت پر پہلے سے حاوی اس طبقے کے افراد تعلیم پا کر حکومت کے اعلیٰ کلیدی عہدوں پر فائز ہو جائیں تو حاکمانہ رویے کے ساتھ ادنیٰ طبقے کے استحصال پر (جو ہمارے ہاں طبقاتی امتیاز کے شعور کا لازمی نتیجہ ہے) خوب قادر ہوسکیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے بعد غریب لڑکوں پر ادنیٰ تعلیم کے دروازے کھولے جائیں تا کہ وہ بڑے ہو کر وقت کی ضرورت کے مطابق ان کے بہتر خدمت گار ثابت ہوسکیں۔ (۲۰)

حفیظ ملک کی یہ رائے تعصب پر مبنی ہے ورنہ سرسید تمام طبقوں کی فلاح و بہبود ان کی لیاقت اور ذہنی سطح کے مطابق چاہتے تھے۔ اس کے باوصف بعض لوگوں کے خیال میں سرسید کی تعلیمی پالیسی میں طبقاتی فرق بھی تھا۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس قائم کیا تو اس میں تین درجے مقرر کیے۔ ان درجوں میں باقاعدہ تفریق پائی جاتی تھی اور طالب علموں کے اندر بھی یہ طبقاتی احساس موجود تھا۔ سرسید کی تعلیمی پالیسی کا یہ ایک کمزور پہلو تھا کہ ادنیٰ، کمتر اور نچلے درجے کے لوگ بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اونچے عہدوں پر فائز ہو جائیں۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان برصغیر کے لوگوں میں ذات پات کے نظام سے وہ بخوبی آگاہ تھے اور سمجھتے تھے کہ اعلیٰ طبقے کے لوگ گوارا نہیں کریں گے کہ ادنیٰ طبقے کے لوگ ان پر حکومت کریں۔ لہٰذا سرسید نے تمام طبقوں کی تربیت کے لیے الگ الگ مراحل مرتب کیے۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:

> کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجے کا آدمی، خواہ اُس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی، اور گو وہ لائق بھی ہو، اُن پر بیٹھ کر حکومت کرے؟ اُن کے مال، جائیداد اور عزت پر حاکم ہو؟ کبھی نہیں، کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا۔ (۲۱)

سرسید کی تعلیمی تحریک نے ایک خاص طبقے یعنی اشرافیہ کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی مگر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے محدود مالی وسائل کی وجہ سے نچلے طبقے کی تعلیم وتربیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دے سکے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اعلیٰ طبقے کے طلبہ اپنے تعلیمی اور بورڈنگ کے اخراجات برداشت کر سکتے تھے مگر غریب اور نچلے طبقے کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ادارے سے نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان تعلیم حاصل نہ کر سکے اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ادنیٰ طبقے کے پڑھے لکھے آدمی کو کہ جب وہ مال وجائیداد پر حاکم ہو اسے کوئی بھی برداشت نہیں کرے گا۔

حواشی

(۱) ضیاء الدین لاہوری، خود نوشت افکارِ سرسید، (لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۹۹
(۲) ایضاً، آثارِ سرسید، ایضاً، ۲۰۰۷ء، ص ۲۸۱
(۳) لارڈ میکالے، میکالے کا نظریۂ تعلیم، ترجمہ عبدالمجید صدیقی، (کراچی: روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، ۱۹۶۵ء)، ص ۶۷
(۴) سرسید احمد خاں، مقالاتِ سرسید، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء)، جلد ہشتم، ص ۳۶
(۵) ڈاکٹر زاہد منیر عامر، تاریخ جامعہ پنجاب، جلد دوم، (لاہور: پنجاب یونی ورسٹی ۲۰۰۴ء)، ص ۳۲
(۶) مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، حصہ دوم، (آگرہ: مطبع مفیدِ عام، ۱۹۰۳ء)، ص، ۸۶۔۸۵
(۷) سرسید احمد خاں، مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، مرتبہ محمد امام الدین گجراتی، (لاہور: مصطفائی پریس، ۱۹۰۰ء)، ص ۴۳۰
(۸) ایضاً، ص ۴۷۵
(۹) سرسید احمد خاں، سفر نامۂ پنجاب، مرتبہ سید اقبال علی، (علی گڑھ: انسٹی ٹیوٹ پریس، ۱۸۸۴ء)، ص ۲۵
(۱۰) ایضاً، مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص ۳۸۴
(۱۱) ضیاء الدین لاہوری، نقشِ سرسید، (لاہور: جمعیۃ پبلیکیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۹۸
(۱۲) ایضاً ص ۹۵
(۱۳) ایضاً، ص ۹۵
(۱۴) ایضاً، ص ۹۴
(۱۵) الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص ۸۴
(۱۶) صفدر سلیمی، پاکستان کا معمارِ اوّل، (لاہور: ادارۂ طلوعِ اسلام، ۱۹۶۷ء)، ص ۱۷
(۱۷) ریاض الرحمٰن شیروانی، کانفرنس گزٹ، علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۵
(۱۸) ضیاء الدین لاہوری، نقشِ سرسید، ص ۱۰۶
(۱۹) سرسید احمد خاں، مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص ۱۵۲
(۲۰) ایضاً، ایجوکیشنل فلاسفی، مرتبہ: حفیظ ملک، (اسلام آباد: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۴۹
(۲۱) سرسید احمد خاں، مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص ۳۴۶

مآخذ

(۱) حالی، مولانا الطاف حسین، حیاتِ جاوید، حصہ دوم، آگرہ: مطبع مفیدِ عام، ۱۹۰۳ء
(۲) خاں، سرسید احمد، مقالاتِ سرسید، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء
(۳) ـــــــ، مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، مرتبہ محمد امام الدین گجراتی، لاہور: مصطفائی پریس، ۱۹۰۰ء

(۴) _____، سفرنامۂ پنجاب، مرتبہ سید اقبال علی، علی گڑھ: انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۸۸۴ء
(۵) _____، ایجوکیشنل فلاسفی، مرتبہ: حفیظ ملک، اسلام آباد: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ، ۱۹۸۹ء
(۶) زاہد منیر عامر، ڈاکٹر، تاریخ جامعہ پنجاب، جلد دوم، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی ۲۰۰۴ء
(۷) سلیمی، صفدر، پاکستان کا معمارِ اوّل، لاہور: ادارۂ طلوعِ اسلام، ۱۹۶۷ء
(۸) لاہوری، ضیاء الدین، خود نوشت افکارِ سرسید، لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء
(۹) _____، نقشِ سرسید، _____، ۲۰۰۷ء
(۱۰) _____، آثارِ سرسید، _____، _____
(۱۱) میکالے، لارڈ، میکالے کا نظریۂ تعلیم، ترجمہ عبدالمجید صدیقی، کراچی: روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، ۱۹۶۵ء

اخبارات و جرائد

۱۔ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۵ء